شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کی تصانیف

(تجزیہ وتعارف)

مولانا نایاب حسن قاسمی

انیسویں صدی کے نصفِ آخر اور بیسویں صدی کے وسط تک ہندوستان کے سیاسی، علمی، تہذیبی وفکری منظرنامے پر جن قدآور شخصیات نے اپنے فکر ونظر، جہدِ مسلسل اور اخلاق وکردار کے تابناک نقوش مرتسم کیے اور ہم عصر ہندوستانیوں سے اپنی گوناگوں خوبیوں، امتیازات اور خصوصیات کا لوہا منوایا، ان میں ایک انتہائی باعظمت نام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا بھی ہے، جنھیں ان کے قدردانوں نے بہ جا طور پر "شیخ الاسلام" اور "شیخ العرب والعجم" جیسے وقیع القاب سے نوازا۔ اسلامی علوم میں ان کی گہرائی وگیرائی، بطورِ خاص علومِ حدیث میں ان کی متخصصانہ شان اور اس حوالے سے عرب وعجم کے وسیع تر دائرے میں ان کی خدمت وشہرت، ملکی وعالمی سیاست وتاریخ کے مدوجزر سے ان کی بصیرت مندانہ واقفیت، اسرار ورموزِ دینی کے معاملے میں ان کی تہ رسی ودروں بینی، ہندوستان کی آزادی کی تحریک میں ان کی بے پناہ قربانیاں اور اس راہ میں ان کی ضرب المثل جاں فروشی، بے خوفی اور جرات وبے باکی، کسرِ نفسی، خلوصِ کامل اور ایثار جیسے نبوی صفات میں ان کی یکتائی وانفرادیت اسی کی متقاضی تھیں۔

بلاشبہ حضرت شیخ الاسلامؒ نہ صرف اپنی اُس عظیم الشان درس گاہ کے علمی فیضانات کے حسین پرتو تھے، جو اپنے قیام سے لے کر آج تک عالمِ اسلام میں دینی علوم کی ترویج واشاعت کے حوالے سے بین الاقوامی سطح پر ممتاز شناخت رکھتی ہے، بلکہ وہ اس تحریکِ جہد وجہاد کے بھی جاں سپار رکن تھے، جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کی اولاد واحفاد سے شروع ہوئی اور سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسمؒ، فقیہ النفس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور بلند فکر، مردم ساز، عبقری شان کے مالک شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے راستے ان تک پہنچی تھی، وہ اپنے وقت میں عظیم الشان عالمِ دین اور محرمِ اسرارِ نبوت بھی تھے، بے باک اور سربہ کف مجاہد بھی، تصوف وسلوک کے امام بھی اور اخلاق واقدارِ اسلامی کے عظیم ترین قدردان اور ان کا پیکرِ محسوس بھی۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ یا تو

ہندوستان کی آزادی کی تحریک کی سرگرمیوں میں گزرا یا دارالعلوم دیوبند کی مسندِ تدریس سے تشنگانِ علومِ نبوت کو سیراب کرنے میں یا پھر اپنے منتسبین ومعتقدین کی روحانی واخلاقی تربیت میں، یہی وجہ ہے کہ بے پناہ صلاحیتوں کے باوصف ان کی تصنیفی خدمات بہت کم ہیں، ان کے قلم کو خاطر خواہ جولانیوں کا موقع ہی کب میسر آیا؟ مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے قلم سے جو بھی تحریریں معرضِ وجود میں آئیں، وہ نہ صرف علمی وتاریخی نکتہ طرازیوں کا اعلیٰ نمونہ ہیں، بلکہ وہ ادبی ولسانی خوبیوں کے حسین شہ پارے بھی ہیں۔ مولانا کے رشحاتِ قلم میں خودنوشت سوانح "نقشِ حیات" کے علاوہ "اسیرِ مالٹا"، "متحدہ قومیت اور اسلام"، "مکتوباتِ شیخ الاسلام"، "مودودی دستور وعقائد کی حقیقت"، "ایمان وعمل" اور "سلاسلِ طیبہ" ہیں، جب کہ جمعیت علمائے ہند کے مختلف اجلاس میں پیش کیے گئے صدارتی خطبات کا مجموعہ "خطباتِ صدارت"۔ ذیل میں حضرت مدنیؒ کی تصانیف کا تعارف وتجزیہ پیش ہے۔

(۱) نقشِ حیات:..... یہ کتاب پہلی دفعہ ۱۹۵۳ / (۱۳۷۲ھ) میں دو جلدوں میں شائع ہوئی تھی، پھر اسے یکجا کر دیا گیا اور اب یہ ایک ہی جلد میں دستیاب ہے، اس وقت سے لے کر اب تک اس کے بے شمار ایڈیشن ہند وپاک کے مختلف مکتبوں سے چھپ چکے ہیں، یہ کتاب اپنے آپ میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے، یہ صرف مولانا کی سوانح ہی نہیں، بلکہ اس وقت کی عالمی سیاست میں برپا ہونے والے ہیجانات کا علمی، منطقی وتاریخی تجزیہ بھی ہے، اس کو لکھنے کی وجہ آپ کے شاگردوں اور نیازمندوں کا غیر معمولی اصرار ہے، جو چاہتے تھے کہ خود آپ کے قلم سے آپ کے حالاتِ زندگی مرتب ہو کر آجائیں تاکہ بعد والوں تک آپ کی زندگی کا صحیح ترین نقشہ پہنچ جائے اور وہ ان حالات سے بھی بہ خوبی واقف ہو جائیں، جن سے آپ، آپ کے استاذِ گرامی (حضرت شیخ الہندؒ) اور بیسویں صدی کے مسلمان گزرے اور ان کے سامنے ان قربانیوں کی سچی جھلکیاں بھی آجائیں، جو اسلامیانِ ہند نے آزادیِ وطن کی خاطر پیش کیں اور کسی بھی قسم کی بزدلی، کم ہمتی کو آڑے نہ آنے دیا، مجاہدِ ملت مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ اس کتاب کے "تعارف اور وجہِ تالیف" کے تحت لکھتے ہیں:

> "۱۹۴۲ / میں جب آپ نینی تال جیل میں قید وبند کی زندگی بسر کر رہے تھے، تو بعض خدام اور بے تکلف احباب نے آپ سے سوانحِ حیات قلم بند کرنے کی درخواست کی تاکہ اس طرح اکابرِ امتِ مرحومہ کے اس اسوہ کا بھی اتباعِ کامل ہو جائے، جس کو امامِ اعظم ابوحنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور دوسرے مقدس اساطین نے اپنے اخلاف کے لیے یادگار چھوڑا ہے، اوّل اوّل آپ نے انکار کیا، لیکن جب عرض وگزارش نے اصرارِ پیہم کی شکل اختیار کر لی، تب مجبور ہو کر قلم اٹھایا اور اپنی زندگی سے متعلق چند صفحات لکھ دیے، مگر جنبشِ قلم جب اس موڑ پر پہنچی، جہاں سے وہ اپنے مقدس استاذ شیخ طریقت حضرت مولانا محمود حسن قدس اللہ سرہ العزیز کا رفیق بن کر میدانِ سیاست میں گام زن ہوئے تھے، تو اس کے سامنے سب سے اہم اور وقیع مسئلہ یہ پیش آیا کہ آخر شیخ الہندؒ اور ان کے رفقائے کار نے یورپین اقوام خصوصاً انگریزی اقتدار کی

مخالفت میں سیاست کی پُرشور اور ہنگامہ آرا زندگی کیوں اختیار کی؟..... چناں چہ حضرت مصنف کے سامنے یہ سوال سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ آیا، یہ پوری جلد، جو آپ کے سامنے ہے، اس کا بیش تر حصہ اسی سوال کا مدلل جواب ہے، دوسری جلد میں قطب العالم، شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کی سیاسی تحریک کے وہ گوشے، جو اب تک پردۂ خفا میں تھے اور رولٹ کمیٹی کی تحقیقاتی رپورٹ بھی جن کو بے نقاب نہیں کرسکی تھی، ان کی نقاب کشائی کی گئی ہے"۔(۱)

اور خود صاحبِ سوانح رقم طراز ہیں:

"عرصۂ دراز سے احباب مجھ سے میری سوانح عمری کی مختلف باتیں دریافت فرماتے رہتے تھے، حسب موقع جواب دیتا رہتا تھا، بعض احباب نے مختلف اخباروں اور رسائل میں ان کو شائع بھی کردیا؛ مگر افراط وتفریط اور زیادتی وکمی سے وہ مضامین خالی نہیں رہے اور بعض چیزیں غلط بھی شائع ہوئیں، جن کے تذکرے پر اصرار کیا گیا کہ صحیح واقعات قلم بند کردیے جائیں، بالآخر ۱۹۴۲ء میں نظر بندی کی نوبت آئی اور جب کہ میں نینی تال جیل، الٰہ آباد میں تھا، تو اس کی پرزور تحریک ہوئی اور کہا گیا کہ اس وقت تو تجھ کو بہت سی مصروفیات سے نجات حاصل ہے، اس کو غنیمت جان کر اس مہم کو پورا کردینا چاہیے۔ کیوں کہ اس میں علاوہ تاریخی واقعات کے تذکرے کے آنے والے لوگوں کے لیے ہدایت اور مشعلیتِ راہ بھی ہے اور نعمائے الٰہیہ کی تحدیث کی عمدہ صورت بھی"۔(۲)

کتاب کے شروع میں آپ نے اپنے خاندان کے حالات بیان کیے ہیں، جن میں آپ کے خاندان اور سلسلۂ نسب کا بھی مفصل اور سیر حاصل تذکرہ ہے، پھر اپنی ابتدائی تعلیم کے واقعات، اس کے بعد دارالعلوم دیوبند میں حصولِ تعلیم کی تفصیلات اور اساتذہ کا ذکرِ خیر ہے، اس ذیل میں آپ نے ان تمام شخصیات کا ذکر کیا ہے، جنھوں نے کسی نہ کسی عنوان سے آپ کو متاثر کیا۔ مولانا نے اس کتاب میں اپنے فن کی خاص رعایت کی ہے، اپنے تعلق سے لکھتے وقت ان نکات واحوال کو خصوصی طور پر مدنظر رکھا ہے، جو قاری کی نگاہ میں غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں، سوانح نگاری اور بالخصوص خودنوشت سوانح نگاری ادب کی انتہائی نازک صنف مانی جاتی ہے، خودنوشت سوانح نگار کا فریضہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ماڈل بنا کر پیش نہ کرے، کہ اس کی تحریر خودستائی وخودنمائی کا مرقع بن کر رہ جائے؛ بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے ساتھ بیتے ہوئے حادثات وواقعات کو بغیر کسی تحفظ کے جوں کا توں بیان کرے، تاکہ اس کی شخصیت کا واقعی سراپا قاری کے سامنے کھل کر سامنے آجائے، اگر وہ ایسا نہیں کرتا ہے، تو نہ صرف یہ کہ اس فن کی روح کے مجروح ہونے کا خطرہ ہے؛ بلکہ اس قسم کی سوانحِ حیات قابل اعتنا نہیں سمجھی جاتی، مولانا کو اس حقیقت کا کامل ادراک تھا، اس لیے آپ کے قلم کی روش پوری طرح فن کی مقتضیات کو پورا کرتی ہے، آپ کہیں بھی یہ ایہام نہ ہونے دیتے کہ سوانح نگار اپنے وقت کا ایک

زبردست عالم، محدث، مرشد اور مجاہد ہے، بلکہ آپ اپنے کو ایک عام آدمی کی طرح پیش کرتے ہیں، جس کی زندگی کا آغاز ایسے ہی ہوا، جیسے کہ دیگر لوگوں کی زندگی کی شروعات ہوتی ہے، اس کا اندازہ آپ کے بچپن کے اس واقعے سے بہ خوبی ہوتا ہے، لکھتے ہیں:

"مجھ کو ہوش وحواس جب آئے، تو میں نے اپنے آپ کو ٹانڈہ میں پایا، بانگرمئو (جہاں آپ کی پیدائش ہوئی تھی) بالکل یاد نہیں، والدین مرحومین کو اولاد کی تعلیم وتربیت کا غیر معمولی اور بہت زیادہ خیال تھا اور اس کے لیے والد مرحوم بہت زیادہ سختی کرتے تھے، اس لیے مجھ کو کھیلنے کا موقع آزادی کے ساتھ صرف چار برس کی عمر تک ملا ہے، جب اس عمر کو پہنچا، تو گھر میں والدہ مرحومہ کے پاس قاعدہ بغدادی، اس کے بعد سپارہ پڑھنا پڑتا تھا، صبح ساڑھے نو بجے تک تو یہ قید اور پڑھائی گھر میں ہوتی تھی اور ساڑھے نو بجے کھانا کھا کر والد مرحوم کے ساتھ اسکول جانا پڑتا تھا، اسکول الہ داد پور سے تقریباً ایک میل یا اس سے کچھ زائد دوری پر ہے، اسکول کی تعلیم میں بھی مدرسین اس زمانے میں خوب مار پیٹ کرتے تھے"۔ (۳)

اس اقتباس سے حضرت کے گھر کے علمی ماحول اور والدین کی اولاد کی بہترین علمی واخلاقی تربیت سے غیر معمولی دل چسپی کا احساس ہوتا ہے، ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مولانا اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھے کہ شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں ماحول اور وراثت دونوں اثر انداز ہوتے ہیں، اس لیے اپنی سوانح اس انداز سے پیش کی کہ قاری کو معلوم ہوجائے کہ سوانح نگار کس حد تک وراثت کا منّت کش ہے اور اس کی نشوونما میں کس حد تک ماحول اور گردوپیش کی کارفرمائی ہے، یہ ذہن میں رہے کہ ماحول اور وراثت دونوں ایک حد تک ہم آہنگ بھی ہیں اور بہت حد تک ان میں ایک دوسرے سے بے گانگی بھی ہے، سوانح نگاروں کا ایک حلقہ وراثت کی زیادتی تاثیر پر زور دیتا ہے، جب کہ دوسرا حلقہ ماحول کو شخصیت کی تعمیر میں زیادہ اثر انداز مانتا ہے، اگرچہ دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ وراثت اور ماحول دونوں تعمیر وتشکیلِ شخصیت کے جوہری عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن ان دونوں کے ساتھ خود شخصیت کے اندر بھی ایک خاص عنصر ہوتا ہے، جو خالص مذاقی یا انفرادی نوعیت کا اور جس کے بغیر کسی بھی ذات کی تعمیر نقطۂ کمال کو نہیں پہنچ سکتی، یہی وہ مقام ہے جس سے اگر صاحبِ سوانح صحیح طور سے عہدہ برآ نہ ہوسکے، تو وہ اپنے راستے سے بھٹک جاتا ہے اور پھر اس کا قلم مختلف وادیوں میں قلابازیاں کھاتا اور اس کی تحریریں افراط وتفریط کی تنگنائیوں میں الجھ کر رہ جاتی ہیں، مولانا نے اس مقام پر بھی فنی نزاکتوں کو مکمل طور پر محسوس کیا اور کہیں بھی اس فن کو مجروح نہیں ہونے دیا ہے اور اپنے مخصوص اندازِ بیان میں اس منزل کو اس خوبی سے سر کیا ہے کہ وہ پڑھنے والے کی دلچسپیوں کا باعث بن گئی ہیں۔

شروع میں یہ عرض کیا گیا کہ "نقشِ حیات" صرف مولانا کے احوالِ زندگی کی دستاویز ہی نہیں، بلکہ یہ اس دور کی سیاسیات ومعاشرت کی مشاہداتی، تجرباتی ومطالعاتی تاریخ بھی ہے، اس لیے جب ہم اس کتاب کے اس حصے کا مطالعہ

کرتے ہیں، جس میں انھوں نے حضرت شیخ الہندؒ کی مجاہدانہ سرگرمیوں کا تذکرہ کیا ہے، تو ہمارے سامنے اس وقت کے سیاسی اتار چڑھاؤ کا مکمل نقشہ سامنے آجاتا ہے اور ان پر آپ کی گہری نظر کا بھی مکمل احساس ہوتا ہے۔

سوانح نگار اگر چاہے تو کسی معمولی سے واقعے کو پھیلا کر اسے ایک مکمل کتابی شکل میں پیش کرسکتا ہے، لیکن یہ وصف کوئی پسندیدہ نہیں کہا جاسکتا، ضرورت سے زیادہ تحریر کے پھیلاؤ سے پڑھنے والا اُکتا جاتا ہے اور پھر اس کے لیے اس کتاب کو از ابتدا تا انتہا پڑھ ڈالنا بہت ہی دشوار ہوتا ہے اور اگر اسے ختم کر بھی لیا جائے، تو قاری کے پلے کچھ بھی نہیں پڑتا اور اس کا دماغ جوں کا توں خالی رہ جاتا ہے، لیکن "نقشِ حیات" میں یہ نقص کہیں بھی نہیں پایا جاتا، اس کے مطالعے سے قاری کے احساس وشعور میں یہ خیال ابھرتا ہے کہ صاحب سوانح نے بڑے بڑے اور اپنے پہلو میں تاریخ کی تہ بہ تہ پرتیں رکھنے والے واقعات کو بھی انتہائی اختصار اور جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس احتیاط کے ساتھ کہ کہیں بھی کتاب کے مرکزی خیال سے انحراف کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا، کتاب کے بعض حصوں میں ایسے تاریخی واقعات بھی آگئے ہیں، جو اپنے دامن میں دراز نفسی لیے ہوئے ہیں، مگر ان کو اس خوش سلیقگی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ وہ طوالت بھی ان کے قلم کی ایک خوبی اور بیان پر ان کی مہارت کی واضح دلیل بن گئی ہے۔

"نقشِ حیات" میں کہیں بھی کسی قسم کی پیچیدگی، اٹکاؤ اور الجھاؤ نہیں ہے، مولانا اپنی عملی زندگی میں خواہ شخصی ہو یا معاشرتی، جس طرح اجلے کیریکٹر اور شفاف وواضح کردار کے انسان تھے، ان کی زندگی کا ہر گوشہ ہر زاویے سے کھلی کتاب کی مانند تھا، جسے ہر شخص بہ آسانی محسوس کرسکتا تھا، اسی طرح ان کی تحریریں بھی اپنے مظاہر اور معنویت کے اعتبار سے بالکل واضح ہیں، انھوں نے جس مسئلے پر بھی قلم اٹھایا ہے، پوری باریک بینی، ژرف نگاہی کے ساتھ اٹھایا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے عمل وکردار کی طرح ان کی نگارشات میں بھی بھرپور سادگی اور وضاحت ہے، محشر اعظمی نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

> "نقشِ حیات میں کسی جگہ الجھاؤ نہیں ملتا، مولانا نے عملی زندگی میں جس طرح ایک واضح، صاف اور متعین راہ اختیار کی تھی، ان کی تحریروں میں بھی وہی بات ملتی ہے، شروع سے آخر تک ایک ہی رنگ اور ایک ہی شان نظر آتی ہے اور کہیں بھی کوئی ایسا موڑ نہیں ملتا، جہاں قلم نے اپنے حدود سے تجاوز کیا ہو اور ادائیگیِ مطلب کے لیے جن الفاظ کی ضرورت محسوس کی گئی ہے، وہی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، مولانا جو کچھ لکھنا چاہتے تھے اور جس مقصد کے لیے انھوں نے قلم کو جنبش دی، قاری اسے بہ خوبی سمجھ لیتا ہے، نہ کہیں کوئی گوشہ تشنۂ تکمیل ہے، نہ کہیں شک کی کوئی گنجایش موجود ہے"۔ (۴)

"نقشِ حیات" مولانا کی ایسی تصنیف ہے، جس میں ان کا اسلوبِ نگارش ایک خاص انداز میں جلوہ گر ہے، جو بہت ہی سنجیدہ اور جامع ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں ایک طرح کی پاکیزگی کا احساس ہوتا ہے، ذاتی تفصیلات

وجزئیات عام طور پر ایسی ہوتی ہیں، جن سے بعض اوقات قاری اکتاہٹ کا شکار ہوجاتا ہے، اس لیے اپنی باتوں کو پیش کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے، اگر بات اختصار طلب ہے، تو اس کو طول دینے سے گریز کرنا چاہیے اور اگر وہ تفصیل چاہتی ہے تو اسے پھیلا کر لکھنا چاہیے، مولانا کے زورِ قلم کا یہ اعجاز ہے کہ وہ خالص ذاتی معاملات کی جزئیات میں قاری کو زیادہ دیر نہیں الجھاتے، بلکہ "نقش حیات" میں پیش کیا گیا ان کی زندگی کا ایک ایک واقعہ کسی نہ کسی خاص پس منظر کا حوالہ ہے، مثلاً جہاں پر انھوں نے اپنی زندگی پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے، وہ حصہ ان کی زندگی کے آئینے میں ہندوستان بھر کی سیاسی واجتماعی حالات کی عکاسی کرنے والا ہے، انھیں اس بات پر کمال حاصل ہے کہ وہ اپنے مطلب کو اس واضح انداز میں سمجھا دیتے ہیں کہ قاری کے ذہن ودماغ میں یقین کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور اس کے احساس ووجدان میں تحریک کی شمع روشن ہونے لگتی ہے۔

"نقش حیات" کا ایک اور اہم گوشہ یہ ہے کہ مولانا نے اس میں پیش کیے گئے ہر واقعے کو دلائل، شواہد اور مستند اعداد وشمار سے مبرہن کیا ہے، چناں چہ جہاں آپ نے انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ اور ان کے ہاتھوں ہندوستان کی تجارت ومعیشت ومعاشرت کی تاراجی کو بیان کیا ہے، تو اسے مدلل کرنے کے لیے خود انگریز مؤرخین کی تصانیف سے حوالے پیش کیے ہیں، اس حصے کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ احساس قلب ودماغ پر چھا جاتا ہے کہ صاحب کتاب کو تاریخ اور اس کے مآخذ سے حیرت ناک حد تک آگاہی ہے، مولانا جہاں مذہبی اور علمی معاملات میں جابہ جا قرآنی آیات اور حدیثی استدلالات کا مضبوط سہارا پکڑتے ہیں اور ان کے ارشادات کی روشنی میں اپنے موقف اور نظریے کی قوت ووقعت پر برہان قائم کرتے ہیں، وہیں تاریخی واقعات کے تذکرے اور تجزیے کے وقت اس فن کی امہات کتب کے حوالے سے اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں اور ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ قاری کسی بھی اعتبار سے شک وشبہ میں مبتلا نہ ہو، بلکہ اس کا ذہن یقین کی سرور بخشیوں سے سرشار ہوجائے، بہ قول محشر اعظمی:

> "نقش حیات میں زیادہ تر انگریزی تصنیفات اور تحریروں کا حوالہ دیا گیا ہے، جن لوگوں نے ہندوستان پر ظلم کیا، اس کی دولت لوٹی اور پھر اپنے احسانات بھی جتائے اور ہر طرح اپنے عیب وجرم کو چھپانے کی کوشش کی، مولانا نے خود انہی کی تحریروں سے انھیں بے نقاب کر دیا اور ان کی پوری قلعی کھول کر رکھ دی اور یہ ثابت کر دیا کہ انگریز ظالم تھے، انھوں نے ہندوستان کا خون چوسنے میں اپنی خوں خواری کا پورا ثبوت دیا"۔(۵)

خلاصہ یہ ہے کہ نقش حیات اپنے وقت کے ایک عظیم عالم ومحدث، تحریک آزادی کے کفن بردوش مجاہد اور شب زندہ دار زاہد کی سیر حاصل داستانِ حیات بھی ہے، جو انتہائی سادگی کے ساتھ بیان کی گئی ہے اور ساتھ ہی بیسویں صدی کے ہندوستان کے سیاسی ومعاشرتی نشیب وفراز کی سچی اور حقیقت نما تصویر بھی۔

(۲) اسیر مالٹا:..... یہ آپ کی اس وقت کی تصنیف ہے، جب آپ کا قلم جوان تھا، اس کے شروع کے صفحات میں

حضرت شیخ الہندؒ کے امتیازی اوصاف وشمائل کو بہت ہی دل آویز اسلوب، انتہائی پرکشش طرز اور ایسے شیریں وسحر انگیز الفاظ میں بیان کیا ہے کہ قاری ان میں جذب ہوکر رہ جاتا ہے، مثلاً شروع کے یہ چند جملے:

"اس نے بحرِ امدادی سے فیوضات حاصل کیے، مگر ڈکار نہ لی، اس نے قاسمی نہریں پی ڈالیں، مگر ہضم کر گیا، اس نے رشیدی گھٹاؤں اور دھواں دھار بادلوں کو چوس لیا، مگر کبھی بے اختیار نہ ہوا، دعویٰ نہ کیا، شطحیات نہ سنائیں، استقامت سے نہ ہٹا، شریعت کو نہ چھوڑا، عشق میں گھل کر لکڑی ہوگیا، مگر دم نہ مارا"۔(۶)

چند صفحات تک تو یہی سحر انگیز اسلوب ہے مگر کتاب کے بقیہ حصے میں تحریر کا یہ رنگ نہیں ہے، اس کتاب میں مولانا نے حضرت شیخ الہندؒ کی تحریکِ آزادی کے نقطۂ آغاز سے لے کر مکہ معظمہ کے سفر، وہاں تک پہنچنے اور پہنچنے کے بعد کی روداد، شریفِ مکہ کی آپ کے تئیں بدگمانی، پھر مکہ میں محبوسی، وہاں سے مصر (جیزہ) کو روانگی اور مصر کی ایک ماہ کی اسارت کے بعد ۱۵/فروری ۱۹۱۷/ (۲۳/ربیع الثانی ۱۳۳۵ھ) کو مالٹا کی روانگی، سفر کے احوال، مالٹا کی مدتِ محبوسیت میں شب وروز کی سرگرمیوں، حضرت شیخ الہندؒ کے سلسلۂ تدریس وترجمہ قرآنِ پاک کے معمولات، حضرت کے دیگر رفقا مولانا حکیم نصرت حسینؒ، مولانا عزیر گلؒ، مولانا وحید احمدؒ اور حضرت مدنیؒ کے شبانہ روز کے اشتغالات، مولانا حکیم نصرت حسینؒ کے سانحہ ارتحال کی روداد، پھر تین سال کی اسارت کے بعد رہائی اور وہاں سے دیوبند تک آمد کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، تتمہ کے تحت کرنل اشرف بیگ، جو حکومت ترکی کے سربرآوردہ لوگوں میں سے تھے اور ان کی اپنی ایک علیحدہ فوج تھی، جو خلافت عثمانیہ کے لیے کام کرتی تھی، صنعاے یمن کے امام یحییٰ نے گورنر انور پاشا کو خط لکھا تھا کہ تم اشرف بیگ کو اپنی فوج کے ساتھ بھیج دو، میں اپنی اور ان کی فوج کے ساتھ مل کر شریف حسین (جس نے خلافت عثمانیہ سے بغاوت کی اور پورے حجاز میں ترکی حکومت کے خلاف احتجاج کا طوفان برپا کر کے وہاں سے اس کا خاتمہ کروادیا) پر چڑھائی کروں، تاکہ اس سے اس کی اسلام دشمنی وانگریز وفاداری کا بدلہ لیا جائے، چناں چہ انور پاشا نے کرنل اشرف کو بھیج دیا، لیکن مدینے میں ہی انھیں اور ان کی فوج کو شریف حسین کے لوگوں نے دھرلیا، دونوں کے درمیان زبردست معرکہ آرائی ہوئی، بالآخر کرنل اشرف کی فوج پسپا ہوگئی اور انھیں گرفتار کر کے اسی جماعت کے ساتھ، جس میں حضرت شیخ الہندؒ اور آپ کے رفقا تھے، مالٹا بھیج دیا گیا، مولانا مدنیؒ نے ان کا، ان کے خاندان کا اور مالٹا کے قیام کے دوران ان کے شریفانہ اخلاق ومعاملات اور حضرت شیخ الہندؒ کے تئیں ان کے غیر معمولی جذبۂ احترام وتکریم کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے، کتاب کے اخیر میں تقریباً سات صفحات میں حضرت شیخ الاسلامؒ کا بھی اجمالی تذکرہ شامل ہے، تذکرہ نویس محمد مبین خطیب ہیں۔

(۳) مکتوباتِ شیخ الاسلام:..... یہ چار جلدوں پر مشتمل آپ کے خطوط کا مجموعہ ہے، جسے آپ کے معتقد ومعتمد خصوصی مولانا نجم الدین اصلاحی نے مرتب کیا ہے، یہ مکتوبات متنوع معلومات کا گنج شائگاں ہیں اور ان سے آپ کی بلند وبالا شخصیت بھی نکھر کر سامنے آتی ہے، یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کی ذات، اسلامی فضائل اور دینی

اوصاف وکمالات کی جامعیت کے لحاظ سے اپنے دور میں ایک بے مثال شخصیت کی حیثیت رکھتی تھی، آپ اسلامی وعربی علوم وفنون، سلوک ومعرفت اور تصوف وسلوک کے ایک ناپیدا کنار سمندر تھے، قدرت نے آپ کے اندر علم وعمل کی جملہ خوبیاں جمع کردی تھیں، یہی وجہ ہے کہ آپ کے مکتوبات میں ان کی جھلکیاں بھرپور انداز میں پائی جاتی ہیں، یہ خطوط وہ ہیں جو آپ نے مختلف اوقات میں اپنے مریدین، معتقدین، دوستوں، عزیزوں، رشتے داروں اور شاگردوں کو لکھے ہیں، ان خطوط کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: ایک حصہ تو ان خطوط کا ہے، جن میں علمی، دینی یا معاشرتی سوالات کے جوابات دیے گئے ہیں، آپ کے دوست، اعزہ اور نیاز مند اکثر کسی نہ کسی مسئلے میں آپ کی رہ نمائی کے خواہاں ہوتے اور آپ کو خط لکھا کرتے تھے، آپ ان کے خطوط کو اولاً انتہائی توجہ سے پڑھتے اور پھر حسب حال انھیں ان کے سوالات کے جوابات لکھ کر بھیج دیا کرتے تھے، آپ کے زیادہ تر خطوط ایسے ہی ہیں اور یہ بات بلا کسی شبہ کے کہی جاسکتی ہے کہ وہ آپ کی علمیت اور وسعت نظری کا اعلیٰ نمونہ ہیں، ان خطوط کو دیکھ کر کوئی بھی انسان آپ کی معلومات کی کثرت اور علم وفضل کی بے کرانی کا معترف ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، ان میں تفسیر وحدیث، فقہ وفتاویٰ، علم کلام وعقائد، سلوک ومعرفت، تاریخ وسیر اور اقتصادیات واخلاقیات کے ٹھوس حقائق پر سیر حاصل اور بصیرت افروز گفتگو کی گئی ہے اور کمال تو یہ ہے کہ اکثر وبیشتر خطوط دورانِ سفر یا ایامِ اسیری میں انتہائی عجلت میں اور قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں مگر اس کے باوصف وہ مستقل مضمون اور علمی وتحقیقی شہ پارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جب ہم مولانا مدنیؒ کے مکتوبات کا مطالعہ کرتے ہیں، تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ذہانت بھی مولانا آزادؒ کے ہم قدم ہے، کسی بھی مسئلے پر لکھتے وقت آپ نے قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کا جائزہ لیا ہے، مشائخ اور اولیائے کرام کے ملفوظات کو انہی کے الفاظ میں بیان کیا ہے، جہاں کہیں کتابوں کے حوالے آئے ہیں، وہاں ان کی عبارتیں انہی کے الفاظ میں نقل کی ہیں اور بعض اوقات ان کے صفحے تک نوٹ کرتے چلے گئے ہیں، اسی طرح اشعار کے استعمال میں بھی مولانا مدنیؒ نہ صرف مولانا آزادؒ کے شریک ہیں؛ بلکہ یک گونہ ان پر فوقیت بھی رکھتے ہیں، مولانا مدنیؒ کے خطوط میں فارسی کے ساتھ اردو کے بہترین اشعار اور غزل کے اشعار بھی بہ کثرت پائے جاتے ہیں اور صرف اسی قدر نہیں، بلکہ ہندی کے بھی نرم ونازک اور رسیلے اشعار خاصی تعداد میں ان کے خطوط میں موجود ہیں۔

مجموعہ مکتوبات کے کچھ خطوط ایسے بھی ہیں، جو بالکل ذاتی اور نجی نوعیت کے ہیں، ان میں جہاں اس وقت کے سیاسی مسائل پر گفتگو کی گئی ہے اور مولانا نے اپنے سیاسی نظریات کی وضاحت کی ہے، ہوسکتا ہے ہر پڑھنے والا اس سے متفق نہ ہو، کہ یہ ممکن بھی نہیں؛ مگر پھر بھی ان کی اس اہمیت سے مجالِ انکار نہیں ہوسکتی کہ وہ اپنے زمانے کے "شیخ الاسلام" کے افکار سیاسی کے بلاواسطہ ترجمان ہیں اور تاریخی دستاویز بھی۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ خطوط کسی بھی شخصیت کا آئینہ ہوتے ہیں، جس میں اس کا اصلی چہرہ نظر آتا ہے، کوئی بھی

آدمی کسی کی خوبیوں اور خرابیوں سے صحیح واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہو، تو وہ اس کے خطوط کا مطالعہ کرنے کے بعد کسی بھی فیصلہ کن پوزیشن تک پہنچ سکتا ہے؛ کیوں کہ یہ وہ تحریر ہے، جو بغیر کسی بناوٹ اور سجاوٹ کے لکھی جاتی ہے؛ کیوں کہ خطوط نہ تو اظہارِ علم کا ذریعہ ہوتے ہیں اور نا ہی اپنی ذات کو بلند آہنگ طریقے سے پیش کرنے کا وسیلہ، بلکہ یہ بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے معاملات کے تئیں خطوط نگار کی بے ساختہ رائے کا اظہار ہوتے ہیں؛ یہی وجہ ہے کہ خطوط کے آئینے میں کوئی بھی شخصیت اپنے اصلی خط وخال سمیت منعکس ہوجاتی ہے، اس لحاظ سے بھی اگر "مکتوباتِ شیخ الاسلام" کا مطالعہ کیا جائے، تو پڑھنے والا مکتوب نگار کی مقناطیسی شخصیت کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا اور وہ بے ساختہ طور پر خود کو ان سے قریب ہوتا ہوا، ان کی جانب کھنچتا ہوا اور ان سے متاثر ہوتا ہوا پائے گا۔

جہاں تک ان خطوط کی زبان کا تعلق ہے، تو وہ عموماً انتہائی سادہ، رواں، سلیس، شگفتہ اور ہر نوع کی پیچیدگی سے مبرّا ہے، البتہ جہاں آپ نے کسی خاص علمی وباطنی مسئلے کی وضاحت کی ہے، وہاں قدرے خشکی پائی جاتی ہے، جس کے بغیر کوئی چارۂ کار بھی نہیں، کیوں کہ وہ مکتوب جس میں خالص علمی، اخلاقی اور باطنی مباحث ہوں، انھیں مکمل طور پر ادبی آہنگ میں نہیں ڈھالا جاسکتا، کہ اس سے مکتوب نگار کے مقصودِ اصلی کے فوت ہوجانے کا دھڑکا پیدا ہوجائے گا اور اصل بات، جو وہ مکتوب الیہ تک پہنچانا چاہتا ہے، الفاظ کی رنگینیوں میں کھوجائے گی، محشر اعظمی نے غالب کے خطوط اور مولانا آزاد کے غبارِ خاطر سے مکتوباتِ شیخ الاسلام کا موازنہ کرتے ہوئے عمدہ تبصرہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> "مکتوبات کا کون سا اسلوب پسندیدہ ہے اور کون سا نہیں، یہ تو اپنے اپنے ذوق کی باتیں ہیں، کسی نے غالب کے خطوط کو ان کی سادگی، بے تکلفی اور ظرافت کی وجہ سے پسند کیا، کسی نے مولانا آزاد کی غبارِ خاطر اس وجہ سے پڑھی کہ اس میں ایک خاص قسم کی چاشنی ہے، الفاظ کی سجاوٹ ہے، جملوں کی خوب صورت ترکیب ہے اور خیالات کی رنگینی کے ساتھ معمولات کا دریا موج زن ہے اور مکتوباتِ شیخ الاسلام کو اس وجہ سے پسند کیا جاسکتا ہے کہ اس میں خالص علمی وروحانی باتیں ہیں، ایسے خطوط جن میں صرف زبان وبیان کی خوبی ہو اور ان میں کوئی بنیادی خوبی نہ ہو، ان کے مطالعے سے قاری کو ایک لذت تو مل سکتی ہے لیکن اس کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا، ہمارے اس نقطۂ نظر پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ معلومات حاصل کرنے کے بہت سے ذرائع ہیں، پھر خطوط ومکاتیب میں اس کا کیا سوال؟ تو یہ بات اپنی جگہ پر درست ہے اور ہم اس سے انکار نہیں کرسکتے، لیکن اس کے باوجود ہمیں یہ سوچنا ہے کہ ہم دوسروں کے مکتوب کیوں پڑھتے ہیں؟ اور کسی کے مکتوب پڑھتے وقت ہمارے دل میں کیا خیال پیدا ہوتا ہے؟ وقت اور دماغ صرف کرنے کے بعد ہمیں کیا ملتا ہے؟ دوسروں کے مکتوب ہم اس لیے پڑھتے ہیں کہ ان سے ہمیں کسی قسم کا فائدہ حاصل ہو، جو تحریر ہمارا وقت اور دماغ لے کر بھی ہمیں کچھ نہ دے سکے، تو اسے

پڑھنے کا کیا حاصل؟ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ خطوط و مکاتیب الفاظ و تراکیب کا حسین مجموعہ تو ہوں، ساتھ ہی ان میں افادیت بھی ہونا چاہیے، مکتوباتِ شیخ الاسلام میں بیش تر مکتوبات ایسے ہیں، جو تعلیم و ہدایت کے آئینہ دار ہیں اور کسی نہ کسی کے استبصار پر لکھے گئے ہیں، وہ خطوط، جن میں علمی، اخلاقی، فقہی اور باطنی مباحث ہوں، انھیں اس سے زیادہ رنگ نہیں دیا جاسکتا"۔(۷)

ان مکتوبات سے منتخب کر کے دو دیگر مجموعے بھی مرتب کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک "معارف و حقائق" ہے، جسے حضرت مدنیؒ کے داماد اور مدرسہ شاہی مراد آباد کے سابق مہتمم مولانا رشید الدین حمیدی نے مرتب کیا ہے، اس میں تصوف وسلوک، فقہ، علمی حقائق، عملیات، اذکار وادعیہ، تعبیر الرؤیا، تاریخ، سیاسیات اور دیگر متفرق موضوعات سے متعلق منتخب تحریروں کو یک جا کیا گیا ہے اور دوسرا مجموعہ "فتاویٰ شیخ الاسلام" ہے اور اس میں خالص فقہی تحریروں کو جمع کیا گیا ہے، اس کے جامع و مرتب حضرت مدنیؒ کے نواسے ممتاز عالم دین وصاحبِ قلم مفتی محمد سلمان منصور پوری مدظلہ العالی ہیں۔

(۴) متحدہ قومیت اور اسلام : ......۸/جنوری ۱۹۳۸/ کی شب میں صدر بازار دہلی کے ایک جلسے میں مولانا مدنیؒ نے تقریر فرمائی، جس کا بڑا حصہ ۹/جنوری کے روزنامہ "تیج" اور "انصاری" دہلی میں شائع ہوا، اس جلسے میں روزنامہ "الامان" (اس کے مدیر مولانا مظہر الدین شیر کوٹی فاضل دیوبند تھے، جو پکے مسلم لیگی تھے) کا رپورٹر بھی موجود تھا، اس نے اپنے حساب سے اس تقریر کی رپورٹنگ کی اور اس کے بعد اسے "الامان" میں شائع کر دیا گیا، پھر اس سے "زمیندار" اور "انقلاب" لاہور نے بھی نقل کیا اور یہ جملہ مولانا سے منسوب کر دیا کہ انھوں نے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ چوں کہ اس زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں؛ اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی قومیت کی بنیاد وطن کو بنائیں۔

اُدھر علامہ اقبال، جو اپنے وقت کے بے مثال اسلامی شاعر اور مفکر تھے اور وہ بھی ایک عرصے تک قومی نظریے کی حمایت میں لکھتے، بولتے اور اس کی ہم نوائی کرتے رہے تھے، ان کی مشہور نظم "ہمالیہ" اور "ترانۂ ہندی" اسی دور کی یادگار ہیں؛ مگر جب انھوں نے یورپ کا دورہ کیا اور وہاں کی تہذیب، طریقۂ زندگی، سیاسی نظریات وافکار کا مشاہدہ کرنے کے بعد وہاں سے واپس ہوئے، تو ان کا سیاسی نقطۂ خیال بدل چکا تھا، انھوں نے واپسی کے بعد قومی راہ نماؤں کو خطوط لکھے، اخبارات میں اپنے مضامین شائع کروائے اور مسلمانوں کو دو قومی نظریے پر ابھارنا شروع کر دیا اور چوں کہ اس وقت مسلم لیگ کا اساسی نظریہ یہی تھا، اس لیے علامہ اقبال اسی کی حمایت وموافقت میں جت گئے، انھوں نے سب سے پہلے ۱۹۳۰/ کے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الٰہ آباد میں خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے شمال مغربی ہندوستان کی علیحدگی کی تجویز پیش کی اور اسے وطن کی معاشرتی مشکلات اور ہندو مسلم منافرتوں کا حل بتلایا، اس کے بعد ان کے افکار کی ساری توانائی اور تخیلات کی تمام تر بلند پروازیاں اسی خیال کو تقویت پہنچانے اور قوم پرست علماء اور لیڈران پر پھبتیاں کسنے میں صرف ہوئیں۔ (جاری ہے)